ہیرو کی تلاش

ہر انسان فطرتاً ساری زندگی اپنا ایک ہیرو تراش کر اس کی تحسین کرتا رہتا ہے۔ بعض لوگ کسی دوسرے کے بجائے ہیرو کے اس منصب پر اپنی ذات کو فائز کر دیتے ہیں اور ساری زندگی نرگس کے پھول کی طرح اپنے عشق کا آپ شکار ہو کر پانی میں اپنا ہی عکس دیکھتے رہتے ہیں۔

باقی لوگ اپنا ہیرو خارج میں تلاش کرتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں چونکہ سپر مین نہیں پائے جاتے، اس لیے جو بھی برا بھلا ہیرو مل جائے لوگ اسی میں سپر مین کی خصوصیات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے لوگ کسی مذہبی یا قومی لیڈر، کھلاڑی یا فنکار یا اپنے قریبی حلقے میں موجود کسی شخص میں اپنا یہ شوق پورا کر لیتے ہیں۔ اس عمل میں یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہر ہیرو کے پیچھے درجنوں عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں، جن کی غیر موجودگی میں ہر ہیرو ایک زیرو بن جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بے نیاز ہم سب اپنے اپنے ہیرو کی تحسین، تعریف اور تکبیر میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ یہ صرف اللہ جل جلالہ کی ہستی ہے جو اپنی ذات میں کامل اور غنی ہے۔ جو صاحب کمال ہے، مگر کمال کو ظہور میں لانے کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ جو صاحب جمال ہے۔ مگر حسن کی انتہا کو تخلیق کر کے بھی بے پروا رہتا ہے کہ اس کو سراہا جائے۔ جو الحی القیوم ہے۔ مگر اپنی زندگی اور بقا کے لیے کسی کا احسان مند نہیں۔ جو ہر لمحے صناعی کے معجزے تخلیق کرتا ہے۔ مگر اپنی قدرت کاملہ کے ظہور کے لیے ہر فانی مخلوق کی مدد سے بے نیاز ہے۔

آہ! لوگ صنم تراشتے ہیں۔ ہیرو تراشتے ہیں۔ مگر محبوب حقیقی، معبود برحق اور اس صاحب کمال کو بھول جاتے ہیں جو کائنات میں اصل اور واحد ہیرو ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ خدا جس طرح نہ ماننے والوں کو نظر نہیں آتا، ماننے والوں کو بھی نظر نہیں آتا۔ ورنہ ہیرو کی تلاش ختم ہو جائے۔

اسٹریس اور ٹینشن

دورِ جدید میں روزمرہ زندگی کے اسٹریس (Stress) نے انسانی صحت کو بہت متاثر کیا ہے۔ تاہم کم ہی لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اسٹریس یا دباؤ اپنی ذات میں کوئی منفی چیز نہیں بلکہ یہ ہماری بقا اور ترقی کا ضامن ہے۔ مثلاً اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو اس کے مکینوں میں فوراً آگ پر قابو پانے کا شدید جذبہ پیدا ہوگا۔ اسی بنا پر لوگ فوراً حرکت میں آ کر آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشکل حالات میں پیدا ہونے والا یہی جذبہ محرکہ اسٹریس ہے۔

تاہم اسٹریس اور اس کے ردعمل میں پیدا ہونے والی جسمانی اور ذہنی کاوش کے بیچ میں ایک چیز ہوتی ہے۔ یہ ٹینشن یا تناؤ ہے۔ اسٹریس جیسے ہی پیدا ہوتا ہے ذہن کچھ کیمیکل خارج کرتا ہے جو ہمارے اعصاب یا نروس سسٹم پر زبردست تناؤ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی تناؤ جسم میں وہ اضافی توانائی پیدا کرتا ہے جو کسی مشکل سے نمٹنے میں ہمیں مدد دیتی ہے۔ جب مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اسٹریس ختم ہو جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر اعصاب پر ٹینشن یا تناؤ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تاہم جب انسان مستقل اسٹریس میں رہنے لگے تو اس کے نتیجے میں اعصاب پر مسلسل تناؤ طاری رہتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسٹریس ختم ہو جاتا ہے، مگر ہمارے اعصاب کو تناؤ میں رہنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ اسٹریس سے نہیں بلکہ اسی تناؤ سے پہنچتا ہے۔ دل کا مرض، بلڈ پریشر، معدے اور نظام ہاضمہ کے مسائل کی اصل وجہ یہی اعصابی تناؤ ہے۔ اسی لیے اس مسئلے کے حل کی بنیادی کنجی یہ ہے کہ جب بھی اسٹریس طویل ہونے لگے فوراً اس چیز کا جائزہ لیا جائے کہ کیا ہم مستقل تناؤ میں تو نہیں۔ اگر ہیں تو گہری سانس لے کر، کسی کھیل کو اختیار کر کے، کسی تفریح میں شامل ہو کر یا کسی اور طریقے سے ٹینشن کو دور کریں۔ کیونکہ انسان کے لیے زہرِ قاتل یہی ٹینشن ہے۔

نارمل انسان

''سر میں آج کل بہت سکون سے ہوں۔''، میں ان کا یہ جملہ سن کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ آج سے پہلے کئی دفعہ وہ میرے پاس اپنے ٹینشن اور پریشانی کا مسئلہ لے کر آئے تھے۔ میں کچھ نہیں بولا لیکن میری خاموشی میں پوشیدہ سوال کو پڑھتے ہوئے وہ خود ہی گویا ہوئے۔

''میں نے اپنے گھر سے اخبار کو تو پہلے بند کرا دیا تھا، مگر انٹرنیٹ پر روزانہ تین چار اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ اب انہیں بھی چھوڑ دیا۔ فیس بک سے چن چن کر ان لوگوں کو اپنی فرینڈ لسٹ سے نکال باہر کیا جو سیاسی اور مذہبی اختلافات، فرقہ واریت اور ملکی حالات کے بارے میں منفی خبریں دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ٹی وی پر آنے والے تمام نیوز چینل دیکھنا بند کر دیے۔ موبائل پر خبروں کی اپ ڈیٹ آتی تھی وہ بھی بند کرا دی۔

اب فارغ وقت میں اچھی کتابیں پڑھتا ہوں۔ گھر والوں سے باتیں کرتا ہوں۔ دوسروں کے دکھ درد میں دلچسپی لیتا ہوں۔ کسی کی مدد کرنا ممکن ہو تو وہ کر دیتا ہوں۔ قرآن مجید سمجھ کر پڑھ لیتا ہوں۔ بس اب زندگی میں سکون ہی سکون ہے۔''

''اور ملکی حالات و معاملات؟''، میں نے ان کے اس سابقہ پس منظر کی روشنی میں انھیں چھیڑتے ہوئے سوال کیا۔ کیونکہ وہ ملکی و بین اقوامی حالات، اندرونی اور بیرونی سازشوں اور اسی نوعیت کی دیگر چیزوں کو لے کر ہمیشہ انتہائی پریشان رہتے تھے۔

''اب میں نے سمجھ لیا کہ مجھے انھی چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا چاہیے جہاں میں کچھ کر سکتا ہوں۔ اور وہ جگہ صرف میرا قریبی حلقہ ہے۔ باقی معاشرے کے لیے فیس بک پر آپ کے پیج سے ایمان و اخلاق اور مثبت سوچ کی باتیں آ گئے شیئر کر دیتا ہوں۔''

میں نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ آخر کار انھوں نے ایک نارمل انسان کی زندگی جینا شروع کر دیا تھا۔

اے کاش......

اس تصویر کو دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔اس میں پنڈی کے حالیہ فساد میں مرنے والے ایک بچے کی لاش کو اس کی ماں دفن سے پہلے آخری دفعہ بوسہ دے رہی تھی۔اس ماں نے اپنا لختِ جگر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔مگر جب اس کی لاش واپس آئی تو ماں کے جھریوں زدہ چہرے پر پڑی ہر شکن سوال پوچھ رہی تھی کہ میں نے اپنے لال کو مرنے کے لیے تو نہیں بھیجا تھا؟

ایسا لگتا تھا جیسا بچہ ابھی ہی سویا ہو۔اس کے چہرے پر کوئی سوال نہ تھا۔اس کا تو وجود ہی سراپا سوال تھا۔ یہ سوال تھا اس قاتل معاشرے سے جو منافق ہو چکا ہے۔جو دہشت گردی کو گلیمرائز کرتا ہے۔مگر جب معصوموں کا قتل عام ہو جائے تو سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔جو فساد کی آگ بھڑکانے والوں کو ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے۔مگر جب ان کی بھڑکائی ہوئی آگ سے عبادت گاہیں جھلس جاتی ہیں تو سراپا ماتم بن جاتا ہے۔

یہ سوال تھا اس معاشرے سے جو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا عادی نہیں رہا۔مگر جب اختلاف کرنے والوں کی لاشیں گرادی جائیں تو اتحاد بین المسلمین کے راگ الاپنے لگتا ہے۔یہ سوال تھا اس معاشرے سے جہاں نفرت کی بولی بولنے والے سب سے زیادہ مقبول ہیں۔مگر نفرت کی فصل جب لہو کے رنگ بکھیرتی ہے تو اسے امن اور محبت یاد آجاتی ہے۔یہ سوال تھا اس معاشرے سے جہاں مرنے والے انسان اور مسلمان نہیں،صرف اپنے فرقے اور اپنے گروہ کے لوگ ہوتے ہیں۔یہ سوال تھا اس معاشرے سے جہاں قاتلوں کو سب جانتے ہیں،مگر ان کی پردہ پوشی کرنا اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

اس سوال کا کوئی جواب دے یا نہ دے، مالک دو جہاں ضرور جواب دے گا۔مگر جب وہ جواب دے گا تو ایسے منافق معاشرے کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔کاش لوگ اس دن کے آنے سے قبل اپنا رویہ بدل لیں۔اے کاش......

اندھیرے یورپ کی پیروی

اوژیے بوزبک (Ogier Ghiselin de Busbecq) سولہویں صدی کا ایک یورپی مصنف، مورخ، سیاستدان اور سفارتکار تھا۔ وہ سلیمان عالیشان کے دور حکومت میں سن 1552 تا 1562 قسطنطنیہ کے دربار میں بطور آسٹریولی سفیر تعینات رہا۔ وہاں قیام کے دوران میں اس نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف Turkish Letters لکھی جو عثمانی خلافت اور ترکوں کو سمجھنے کے لیے اس دور کے یورپ کے لیے سب سے اہم ماخذ بن گئی۔

اس نے ترکوں کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ ترکوں کو جب کوئی غیر معمولی اہلیت کا آدمی مل جاتا ہے تو وہ اس کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔ لیکن ہم (یعنی یورپین) کسی آدمی کی قابلیت کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے تعلیم و تربیت دینا ہمارا فرض ہے۔ جبکہ ترک قابل آدمیوں سے کام لینا جانتے ہیں۔

بوزبک سلیمان کا ہم عصر ہے جس کے دور میں عثمانی خلافت کا اقتدار مشرقی یورپ سے آگے بڑھ کر وسط یورپ میں آسٹریا تک جا پہنچا تھا اور موسم خلاف نہ ہو جاتا تو اپنی آخری یلغار میں سلیمان ویانا پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ احیائے علوم کے جوش سے سرشار جنوبی یورپ جو اس وقت یورپی تہذیب و ثقافت اور قوت کا مرکز تھا اور جس نے کچھ عرصے بعد مسلمانوں کو اندلس سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا، ترکوں کے نام سے لرزتا تھا۔ جبکہ دنیا کے تین براعظموں یعنی ایشیا، افریقہ اور یورپ میں ترکوں کا اقتدار قائم تھا۔

عام طور پر مسلمان ماضی کے اپنے اقتدار کو اپنی قوت و بہادری اور اپنی شکستوں کو اغیار کی سازشوں کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ تاہم کسی قوم کے عروج و زوال میں جو اہم ترین اور بنیادی وجہ ہوتی ہے، بوزبک نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اسے بہت اعلیٰ طریقے پر بیان کر دیا ہے۔ یعنی جو

اقوام اپنے قابل لوگوں کی قدر کرتی ہیں تو عظمت حاصل کرتی ہیں اور جو نہ کریں وہ پیچھے رہ جاتی ہیں۔ بوزبک اور سلیمان دونوں جن تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے وہ اس کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ترکوں کا طریقہ تھا کہ وہ غیر اقوام کے بچوں کو اپنے ہاں لاتے اور انہیں بہترین تربیت دیتے۔ اور پھر ان میں سے بہترین لوگوں کو بلا تعصب اعلیٰ فوجی اور سیاسی عہدے عطا کر دیتے۔ جبکہ یورپ کا بادشاہی اور مذہبی نظام اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ہر باصلاحیت آدمی کو کچل کر رکھ دے اور مخصوص خاندانوں اور ایک خاص طبقے کا اقتدار باقی رہے۔ یورپ میں یہ صورتحال اٹھارہویں صدی تک باقی رہی، مگر اس کے بعد استحصالی طبقات کو شکست ہوگئی۔

آج حال یہ ہے کہ مغربی ممالک ترکوں کی طرح دیگر اقوام کے اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے نوجوانوں کو اپنے ہاں لاتے ہیں اور بہترین مراعات دے کر ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ صلاحیت ان کی قوت میں مسلسل اضافے اور ان کے زوال کو روکنے میں بہت معاون ثابت ہورہی ہے۔ جبکہ دوسری طرف مسلمانوں اور خاص کر اہل پاکستان کم و بیش اسی جگہ پر کھڑے ہیں جہاں قرون وسطیٰ کے عہد جاہلیت کا یورپ تھا۔ جہاں بادشاہ اور اشرافیہ عام لوگوں کو تعلیم و تربیت تو کیا دیتے الٹا ان سے جینے کا حق چھین رکھا تھا۔ وہ ان کا خون نچوڑتے اور بدترین معاشی اور سیاسی استحصال کا نشانہ بناتے۔ چرچ ہر مختلف آواز کو سنتے ہی ان کے ختم کر دینے کا فرمان جاری کر دیتا۔ یورپ کی مسیحی عدالتیں اہل علم و فن پر بددینی کے فتوے لگا کر انہیں قتل کر رہی تھیں۔ تنقید اور اختلاف کرنے والے ہر شخص کے لیے جینا مشکل تھا۔ ان کی کتابیں جلا دی جاتیں اور وطن میں رہنا دشوار کر دیا جاتا۔

قابل اور بہتر لوگوں کی اسی ناقدری نے یورپ کو صدیوں اندھیرے میں رکھا۔ اگر آج ہم اُسی اندھیرے یورپ کی پیروی کریں گے تو یہی اندھیرا ہمارا انجام ہوگا۔

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا

کسی شاعر نے اپنے محبوب کے وصل و فراق کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا

اور جنت کیا اور جہنم کیا

شاعری میں یہ مبالغہ عام ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایک بندہ مومن بار بار اس تجربے سے گزرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں یہ مرحلہ بار بار آتا ہے کہ کسی وقت انسان پر شوق کا غلبہ ہوتا ہے۔ عبادات میں دل لگتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوں جاری رہتے ہیں۔ دل ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ گناہ سے فطری کراہیت محسوس ہوتی ہے۔

مگر پھر ایک روز اچانک یہ کیفیت رخصت ہوجاتی ہے۔ شوق تو دور کی بات ہے، اعمال صالحہ کی طرف طبیعت کا رجوع باقی نہیں رہتا۔ گناہ کی شدید خواہش بیدار ہوجاتی ہے۔ دنوں تک انسان کو یاد بھی نہیں آتا کہ اس کا کوئی رب ہے۔ انسان بہت جبر کرتا ہے تو رسمی طور پر نماز کے نام پر کچھ اٹھک بیٹھک ہوجاتی ہے۔ مگر کسی عبادت میں دل نہیں لگتا۔

پہلی کیفیت صاحب ایمان کے لیے اگر جنت ہوتی ہے تو یہ دوسری کیفیت جہنم سے کم نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں کیفیات راہ خدا کے راستے کا لازمی موڑ ہیں۔ پہلا موڑ اس لیے آتا ہے کہ انسان خدا سے تعلق کی لذت کا تجربہ کرکے اس روحانیت میں جینا سیکھ لے جو اسے حیوانیت سے بلند کرتی ہے۔

مگر یہ کیفیت اگر مستقل رہے گی تو انسان کا امتحان ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ نیکی میں مزہ اور گناہ سے نفرت اگر مستقل کیفیات ہوجائیں تو پھر اجر کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے یہ کیفیت رخصت ہوجاتی ہے۔

ایسے میں مخلص اور حساس لوگ پریشان ہوجاتے ہیں۔ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دھتکار دیے جانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اپنے کسی گناہ کا نتیجہ سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اکثر اوقات یہ کیفیت اللہ کے اسی طریقے کے مطابق ہوتی جس کے مطابق وہ کائنات کا پورا نظام چلاتے ہیں۔ یعنی دن کے بعد رات بھی ہوتی ہے۔ بہار کے بعد خزاں بھی آتی ہے۔ نہ رات بری ہے نہ خزاں ہی بے فائدہ ہے۔ ہر ایک کی اپنی مصلحت ہے اور اس کیفیت کی مصلحت یہی ہے کہ انسان کا امتحان ہوجائے کہ وہ مزے کے لیے عبادت کرتا ہے یا خود پر جبر کرکے بھی عبادت کرسکتا ہے۔

اسی طرح اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ کیفیت انسان کے اندر پیدا ہونے والے تکبر کو دور کرتی ہے۔ ہر وقت یادالٰہی اور نیکی کی کیفیت بہرحال انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ کوئی بہت بڑی ہستی بن چکا ہے۔ مگر ایسے میں دوری کے یہ لمحات اسے واپس ایک عام اور عاجز انسان ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس احساس کی اللہ کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے اور اسی کیفیت کی وجہ سے انسان اللہ کے ہاں بہت مقبول ہوجاتا ہے۔

اس کیفیت کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے گزر کر ہی کوئی انسان معرفت اور قرب الٰہی کی منزل کے قریب پہنچتا ہے۔ یہ گویا سفر کی تعبیر ہے جس میں خوش نما باغات بھی آتے ہیں اور لق و دق صحرا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اس کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اپنے رب کی طرف سفر مسلسل جاری ہے اور بندہ اگر مایوس ہوئے بغیر عمل صالح کو خلاف طبیعت ہونے کے باجود جاری رکھے تو نہ صرف قرب الٰہی کی کیفیات دوبارہ لوٹ آتی ہیں بلکہ انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ دوسروں کی تربیت اور رہنمائی بھی کرسکے۔ چنانچہ یہ کیفیت دراصل ایمان میں ترقی کی علامت ہے نہ کہ ایمان کے سلب ہوجانے کی کوئی نشانی۔

''جب زندگی شروع ہوگی'' کی اصل محرک کا انتقال

''میں تہجد میں اٹھ کر یہ دعا مانگ رہی ہوں کہ میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔''

اس دنیا میں کس میں یہ حوصلہ ہے کہ کسی غیر سے یہ بات کہے۔ مگر مجھ سے یہ جملہ کہنے والی بہن بہت چھوٹی عمر میں اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے خالق و مالک کے حضور لوٹ چکی ہے۔

یہ سن دو ہزار دس کی ابتدا کا ذکر تھا۔ میں ''جب زندگی شروع ہوگی'' مکمل کر چکا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے حوالے سے میں ایک گومگوں کی کیفیت میں تھا۔ پھر ایک روز اچانک پتہ چلا کہ مجھے ایک مہلک مرض نے آ گھیرا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ اگر میری زندگی کا اختتام ہے تو پھر یہ کتاب ایک امانت ہے جسے لوگوں تک ہر حال میں پہنچنا چاہیے۔ سو اس کی اشاعت کا فیصلہ کرلیا گیا۔

اس کا فون آیا تو اسے اس فیصلے سے مطلع کیا تو بہت خوش ہوئی۔ وجہ اشاعت یہ بتائی کہ مرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ اس پر بہت دل گرفتہ ہوئی۔ وہ جملہ کہا جو اوپر نقل ہوا ہے۔ میں اس بات پر بہت ناراض ہوا۔ مگر کیا کیجیے وہ جینے کا ارادہ شاید پہلے ہی چھوڑ چکی تھی۔ شاید اس وقت جب میں نے ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے ابتدائی چند ابواب اسے پڑھنے کے لیے بھجوائے تھے۔

یہ چند ابواب بس ایسے ہی رواروی میں بیٹھ کر لکھ دیے تھے۔ انہیں کسی مکمل کتاب کے قالب میں ڈھالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر اس تک پہنچے تو اس کی دنیا تلپٹ ہوگئی۔ اتنا زیادہ اثر لیا کہ بہت شدید بیمار ہوگئی۔ فون پر کہا کہ اب زندہ رہنے کا دل نہیں چاہتا۔ اس طرح کی باتوں پر اسے میرے ہاتھوں ڈانٹ پڑتی رہتی تھی۔ اس ڈانٹ کا اثر بھی ہوجایا کرتا تھا۔ خیر ڈانٹا، بہت سمجھایا۔ وہ ٹھیک ہوئی تو میرے پیچھے لگ گئی کہ کتاب پوری کریں۔ اصرار اور طرف سے بھی تھا،

مگراس نے تو ناک میں دم کر دیا تھا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے وہ کتاب مکمل کرا ہی دی جس نے نجانے کتنے لوگوں کو آخرت کی زندگی سے متعارف کرایا۔ اوراب اس کتاب کی تکمیل کی اصل محرک خود اس دنیا کا حصہ بن چکی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

وہ بے حد حساس تھی۔ جتنی حساس تھی اتنے ہی زندگی میں دکھ جھیلے تھے۔ شادی شدہ تھی۔ مگر شادی شدہ زندگی جن سکھوں سے عبارت ہوتی ہے وہ اس کی زندگی میں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنا ہر دکھ مجھے سناتی تھی۔ میں صبر کی تلقین کرتا۔ مگر وہ گھلتی گئی۔ جلتی ہوئی شمع کی طرح پگھلتی گئی۔ اور ایک روز ہمیشہ کے لیے یہ شمع بجھ گئی۔

اس کی زندگی بھی ایک شمع کی مانند تھی۔ ہمیشہ دوسروں کے دکھوں کے لیے پریشان رہتی۔ ہر طرح سے دوسروں کی مدد کرتی۔ دین کا ذوق اورفہم بہت اچھا تھا۔ خواتین میں دین کی اتنی اچھی سمجھ میں نے شاذ ہی کبھی دیکھی تھی۔ اس کے اردگرد کے سارے لوگ اس سے دینی سوالات کرتے۔ وہ جواب دے دیتی۔ پھر احتیاطاً مجھے فون کر کے کنفرم کرتی کہ صحیح بات بتائی ہے یا کوئی غلطی کی ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس نے کسی کو غلط جواب دیا ہو۔ میں اس کی زندگی میں آنے والی ہر محرومی کے جواب میں یہ کہتا کہ اللہ نے تمھیں دنیا داری کے لیے نہیں دین کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

مطالعے کی بے حد شوقین تھی۔ جیب خرچ میں ملنے والی بیشتر رقم کتابیں خریدنے پر خرچ کر دیتی اور شوہر سے بہت ڈانٹ کھاتی۔ زندگی کے آخری دنوں میں ایک روز اس نے مجھے فون کیا۔ وہ بہت دکھی ہوتی تو مجھے ہی فون کرتی تھی۔ وہ مطالعہ نہیں کر پا رہی تھی کہ چشمہ ٹوٹ گیا تھا اور شوہر سے بار بار کہہ رہی تھی کہ چشمہ بنوا دو۔ جواب میں اسے تھپڑ کھانے کو ملا۔ یہ واقعہ سنا کر وہ بہت روئی۔ میں نے اسے بہت تسلی دی لیکن اِس روز فون بند کر کے میں بھی رو پڑا۔

وہ اپنے شوہر سے دیوانہ وار عشق کرتی تھی۔ شوہر نے دوسری شادی کا ارادہ کرلیا۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکی۔ خود کو روگ لگا بیٹھی۔ بڑے حوصلے سے شوہر کی دوسری شادی کو دیکھا۔ شادی کی ساری شاپنگ خود کرائی۔ مگر وہ اتنی بہادر نہیں تھی جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس لیے چند ماہ بھی نہ جی سکی۔ گرچہ دوسری لڑکی بھی اچھی تھی۔ مگر وہ شرکت گوارا کرنے کی روادار نہیں تھی۔ میں نے شادی سے پہلے ہی بہت سمجھایا تھا کہ شوہر کو دوسری بیوی کے حوالے کر کے خود کو اللہ کے لیے وقف کردو۔ مجھے معلوم تھا کہ اللہ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کی ضرورت تھی کہ اس کا دھیان دوسری سمت بٹ جائے۔ کاش ہندوستانی پس منظر کی ہماری بہنیں یہ سمجھ لیں کہ شوہر اتنا قیمتی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے اپنی جان کو روگ لگایا جائے۔ زندگی میں شوہر کے سوا بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس کی زندگی میں اور کچھ تھا بھی نہیں۔ میں کتنی باتوں کا راز دان ہوں، مگر اس نے وعدہ لیا تھا کہ خاموش رہوں گا۔ سو میں خاموش ہی ہوں۔

میرے لیے بس ذاتی اطمینان کی ایک ہی بات ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ سے دوسروں کے لیے مدد مانگی تھی۔ اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ بلکہ الٹا میرے اور میری بیوی بچے کے لیے تحفے بھیجتی رہتی تھی۔ آخری دنوں میں جب ڈاکٹروں نے ہسپتال سے جواب دے کر گھر بھیج دیا تھا تو اپنی بہن کے ذریعے سے اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اسے وہیل چیئر خرید کر لے دوں۔ وہ اسلام آباد میں تھی اور میں ہزار میل دور بیٹھا تھا۔ پھر بھی میں نے ایک اور دینی بہن فریدہ سے رابطہ کر کے اس کے گھر بھیجا۔ فریدہ نے جو حالات بتائے اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب اسے وہیل چیئر کی کوئی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔ مگر ایک بھائی کو بہر حال بہن کا مان رکھنا تھا۔ بھلا ہو برادرم ندیم اعظم کا کہ انھوں نے میرے ایک فون پر اگلے ہی دن وہیل چیئر اس کے پاس پہنچوادی۔

پھر آج اس کی وفات کے ایک ہفتے بعد فریدہ کو معلوم ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہے۔ ایک گہرے کرب نے مجھے گھیر لیا ہے۔ یہ وہ دن ہیں جب ایک دفعہ پھر میں ہزاروں برس پر پھیلی فلسفے کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ فلسفی ہر چیز کا جواب برا بھلا دے رہے ہیں۔ مگر ایک چیز ان کے احاطہ تصور سے باہر ہے۔ یہ آخرت کی وہ زندگی ہے جس کے بغیر اس دنیا کی کسی پہیلی کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اس دنیا میں دکھ کیوں ہیں؟ موت کیوں ہے؟ اعلیٰ انسان اس قدر بے بسی سے زندگی گزار کر کیوں مر جاتے ہیں؟

باخدا آخرت نہ ہو تو خدا پر ایمان لانا بھی ممکن نہیں۔ یہی ایمان ہے جو کرب کے ان لمحات میں مجھے یقین دلا رہا ہے کہ مرنے والی نے اپنے بدترین دن دیکھ لیے ہیں۔ اب اس کی زندگی میں کوئی دکھ اور کوئی محرومی نہیں آئے گی۔ رحمت خداوندی نے فردوس بریں میں اسے رب سے نزدیک جگہ دے دی ہے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ میں حضرت آسیہ کی طرح اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اپنے پاس میرا گھر بنا دیں۔ ایسے دکھی لوگوں کی دعا اللہ تعالیٰ ضرور سنتے ہیں۔ اس لیے اس کا گھر بنا دیا گیا تھا، مگر وہ گھر ہی کیا جس میں مکین نہ ہو۔ مالک ذوالجلال نے فیصلہ کیا اس بے رونق گھر کو رونق بخش دی جائے۔ سو گھر والی کو بلا لیا گیا۔ یہ اس کی موت نہیں ہے۔ اس کی زندگی اب شروع ہوئی ہے۔

ایک متعصب شخص عالم بن سکتا ہے مگر
ایک سچے عالم کا متعصب ہونا بہت مشکل ہے (ابو یحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 7۔ اٹل حقیقت کو تسلیم کرلیں

کیس اسٹڈی:

وہ آج بہت خوش تھا اور خوش کیوں نہ ہوتا۔ آج اسے برسوں پرانے سپنے کی تعبیر مل گئی تھی۔ وہ خوشی سے سرشار اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

"امی! میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے ائیر فورس میں پائلٹ کے طور پر منتخب کرلیا گیا ہے"۔

ماں اس کی بلائیں لینے لگی اور دعا دینے لگی۔ وہ ماں کو یہ خوشخبری دینے کے بعد بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا تاکہ جلد از جلد رپورٹ کرکے اپنی ڈیوٹی جوائن کرسکے۔ ابھی مغرب ہی ہوئی تھی اور اسے پوری رات کاٹنی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل دفتر جانے کے لیے کچھ اچھے کپڑے خرید لے۔ چنانچہ وہ ایک دوست کے ساتھ بازار گیا اور شاپنگ میں مصروف ہوگیا۔ ابھی وہ دوکاندار سے بھاؤ تاؤ میں مصروف ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ایک شدید دھماکے کی آواز آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ چھت اس کے سر پر گرگئی ہو۔ پھر اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب ہوش آیا تو ابتدا میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جب غور سے دیکھا تو علم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ٹیسوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹروں کی ایک ٹیم داخل ہوئی۔ ان کے ساتھ اس کی ماں بھی تھی جس کی آنکھیں رونے کے باعث سوجھ چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، ایک ڈاکٹر اس سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر وقاص! آپ بازار میں ایک بلاسٹ کا شکار ہوگئے تھے۔ اس میں کئی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ بچ گئے ہیں۔ لیکن ایک بری خبر یہ ہے کہ بلاسٹ میں آپ کی

دونوں ٹانگیں ضائع ہوچکی ہیں"۔

وقاص کے لیے یہ دھماکہ پہلے والے بلاسٹ سے شدید تر تھا۔ وقاص کی دنیا ویران ہوچکی تھی۔ دن گذرتے گئے لیکن وقاص مایوسی اور پژمردگی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس کا وجود ایک زندہ لاش کی مانند تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ مر کیوں نہیں گیا۔ لیکن اس قسم کی سوچوں سے مسئلہ حل ہونے کی بجائے بڑھنے لگا۔ وہ ایک دن اسی مایوسی کے عالم میں کتاب کے صفحات پلٹ رہا تھا کہ ایک دعائیہ جملے نے اس کی توجہ مبذول کرلی۔ وہ بار بار ڈاکٹر ربن ہولڈ کے اس جملے کو پڑھنے لگا۔

"اے اللہ ! مجھے اتنی عقل عطا فرما کہ میں ان حالات سے سمجھوتہ کرلوں جنہیں بدلنے پر میں قدرت نہیں رکھتا"۔

اس جملے نے اس کی زندگی بدل دی۔ اس نے سوچ لیا کہ یہ ٹانگیں واپس نہیں آ سکتیں اور نہ ہی اسے پائلٹ کی نوکری دوبارہ مل سکتی ہے۔ لیکن دنیا دو ٹانگوں اور پائلٹ کی ملازمت پر ہی ختم نہیں ہوجاتی۔ چنانچہ اس نے ایک گھر کے قریب ایک کالج جوائن کرلیا اور درس و تدریس میں مشغول ہوگیا۔

آج کئی برس بعد اس کی بیوی بھی ہے اور بچے بھی۔ وہ اپنے بچوں کو خوش و خرم لہجے میں یہی درس دیتا ہے کہ " جس حقیقت سے فرار ممکن نہیں اس حقیقت کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرو"۔

وضاحت

زندگی میں ہمیں دو طرح کی ناخوشگوار حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک وہ معاملات ہیں جنہیں ہم بدلنے پر قادر ہیں جیسے بیمار ہونے پر دوائی کھانا۔ دوسری جانب وہ امور ہیں جو ناخوشگوار تو ہیں لیکن ہم انہیں بدلنے پر قادر نہیں۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ ہی عقل مندی ہے۔ مثال

کے طور پر معذوری، بدصورتی، کسی عزیز کی موت، کوئی مالی محرومی، کسی قیمتی شے کا کھو جانا وغیرہ۔ ان تمام معاملات میں اگر کوئی شخص خود کو ایڈجسٹ نہ کر پائے تو زندگی مشکل تر ہو جاتی بلکہ جہنم بن جاتی ہے۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ کر کے آگے کی طرف دیکھنا اور مثبت زندگی کا آغاز کرنا ہی واحد چارہ ہوتا ہے۔ ایلسی میک کارمک کا کہنا ہے کہ جب ہم کسی ناگزیر صورت حال سے جنگ کرنا ترک کر دیتے اور اسے قبول کر لیتے ہیں تو ہم وہ توانائی حاصل کر لیتے ہیں جو ایک کامیاب اور بھرپور زندگی کے لیے ضروری ہے۔

لیکن اس ضمن میں عام طور پر افراط وتفریط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آیا یہ حقیقت بدلی جاسکتی ہے یا نہیں۔ نیز کیا اس واقعہ کا ذمہ فرد خود ہے یا حالات۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اب یہ تو ایک حقیقت ہے کہ اسے یہ فیصلہ قبول کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ان اسباب کو بھی تلاش کرنا ہے جن کی بنا پر وہ ناکام ہوا۔ اگر وہ اس ناکامی کو اٹل حقیقت سمجھ کر بیٹھ جائے تو بے وقوفی ہوگی۔ بالکل ایسے ہی اگر کوئی شخص بیمار ہے تو آخری حد تک اس بیماری سے لڑے گا کیونکہ یہ ایک اٹل اور ناقابل تبدیل حقیقت نہیں بلکہ اس صورت حال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اٹل حقیقت کو اٹل سمجھنے کا فیصلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

اسائنمنٹ

۔ان حقائق کی فہرست بنایئے جو آپ کے لیے ناخوشگوار ہیں لیکن اٹل ہیں یعنی تبدیل نہیں ہوسکتے۔

۔اٹل حقیقتوں کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کے لیے آپ کیا لائحہ عمل تیار کریں گے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

جنسی بے راہ روی کا حل

سوال: السلام علیکم

میں ایک سافٹ وئیر انجینئر ہوں اور اسی وجہ سے زیادہ تر وقت انٹرنیٹ پر ہی گزرتا ہے۔ میں جنسی خواہشات کو ابھارنے والی بلیو فلمیں دیکھنے کی بری عادت کا بری طرح شکار ہوں اور اسی کی وجہ سے جب بھی میری نظر کسی لڑکی پر پڑتی ہے تو میرا تقویٰ اور خوف خدا بالکل اسی طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کہ میں سرے سے مسلمان ہی نہیں۔ میں اپنی اس عادت کی وجہ سے عذاب، قبر، سکرات الموت اور اس کی سختی سے بہت ڈرتا ہوں برائے کرم میری اس معاملے میں مدد فرمایئے، (سائل کا نام حذف کر دیا گیا ہے)۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مسئلہ نا قابل علاج نہیں ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ آپ ایک بری عادت کو برا سمجھتے ہیں اور اس سے بچنا چاہتے ہیں۔ آپ کو بس اپنی عادات کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ پھر آپ کی جان ان چیزوں سے چھوٹ جائے گی۔

دیکھیے سب سے پہلے تو کوشش کیجیے کہ انٹرنیٹ کو صرف انتہائی مجبوری میں استعمال کریں کیونکہ یہی اس وقت جنسی مواد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ اپنا کمپیوٹر ایسی جگہ رکھیں جہاں دوسرے لوگوں کی نگاہ پڑتی رہے۔ اس سے آپ مجبور ہو جائیں گے کہ کوئی بھی ایسی فلم نہ دیکھیں۔ اسی طرح موبائل بالکل سادہ رکھیں جس پر کوئی فلم وغیرہ نہ چل سکے۔

کوشش کریں کہ کسی قسم کی کوئی بھی فلم نہ دیکھیں۔ کیونکہ شیطان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب

انسان بڑے گناہ سے رکتا ہے تو وہ چھوٹی چیزوں کی طرف انسان کو لے کر جاتا ہے اور پھر وہاں سے مزید خواہش کو بیدار کر کے انسان پر قبضہ کر لیتا ہے۔

جہاں تک لڑکیوں کو دیکھ کر خوف خدا کو بھولنے کا سوال ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ جیسے ہی کسی نامحرم لڑکی پر نگاہ پڑے فوراً اپنی نظر کو پھیر لیں۔ آپ کو شروع میں کچھ مشقت ہوگی مگر زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ آپ کو اس کام میں اتنا مزہ آئے گا کہ کچھ حد نہیں۔ انسان کا سب سے بڑا لطف فتح حاصل کرنے میں ہوتا ہے۔ نظر پھیرنا ایک نوجوان کی سب سے بڑی فتح ہے۔ اس کا مزہ ایک دفعہ آپ نے چکھ لیا تو اسے چھوڑیں گے نہیں۔

منگنی کے رشتے کو جلد از جلد شادی میں بدلیے۔ اس مسئلے کا حقیقی حل یہی ہے۔ باقی سارے حل کسی بھی وقت فیل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے شادی میں جلدی کریں۔

ان سب کے باوجود کبھی غلطی ہو جائے تو مایوس مت ہوں۔ فوراً توبہ کر کے آئندہ بچنے کا عزم کریں۔ یاد رکھیں توبہ کبھی گناہ کو انسان پر حاوی نہیں ہونے دیتی۔

نماز میں خیالات سے نجات

سوال: السلام علیکم

محترم ابو یحییٰ صاحب! انسان نماز میں خیالات کی یلغار پر کیسے قابو پا سکتا ہے؟ (راحت عباس)۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نماز میں خیالات سے نجات پر کوئی دینی مطالبہ نہیں۔ اصل مطالبہ خشوع کا ہے۔ خشوع اس

احساس کا نام ہے کہ ہم ایک بلند و عظیم ہستی کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ سب سے پہلے جسم پر ہونا چاہیے یعنی نماز پورے ادب کے ساتھ، باوقار طریقے سے، سارے ارکان درست طریقے سے ادا کرتے اور غیر ضروری حرکات سے بچتے ہوئے ادا کرنی چاہیے۔ پھر دل میں یہ احساس زندہ رہنا چاہیے کہ ہم کس عظیم ہستی کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس کے لیے آنکھ میں آنسوں اور دل میں رقت اور خیالات میں یکسوئی ضروری نہیں۔ صرف نماز میں یہی احساس زندہ رہے کہ میں اللہ کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا ہوں تو بڑی بات ہے۔ اور جب خیالات کی یلغار ہو تو احساس ہونے پر اللہ سے التجا کر لیں کہ پروردگار دل پر قابو نہیں لیکن جس پر قابو ہے یعنی جسم اسے لے کر حاضر ہوں۔ اسے قبول فرما۔ انشاءاللہ نماز مقبول ہوگی۔

بے عملی کی وجہ سے دعوت کا کام چھوڑنا

سوال: السلام علیکم

محترم ابو یحییٰ صاحب! پہلے میں جو چیز بھی پڑھتی تھی تو پورے جوش کے ساتھ اپنے گھر میں اور فرینڈز کو بتاتی تھی۔ لیکن جب سے یہ چیز پتا چلی کہ عالم بے عمل کا کیا انجام ہوگا (کیونکہ کئی بار میں کئی ایک معاملوں میں اسی ٹیسٹ میں فیل ہو گئی)۔ تو ڈر کے مارے میں نے بولنا ہی چھوڑ دیا۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ عمل کروں، لیکن سو فیصد تو کیا پچاس فیصد بھی نہیں کر پاتی، عشرت۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دیکھیے جس عالم کی پکڑ کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے وہ دراصل ایسا شخص ہے جو جان بوجھ کر اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ مگر جو شخص انسانی کمزوریوں کی بنا پر عمل نہ کر پائے تو بہر حال اس کا معاملہ

مختلف ہوگا۔ گرفت اس کی بھی ہوگی مگر ایسے ہی جیسے عام انسانوں کی بے عملی کی ہوگی۔ ایسے شخص کو دعوت کا کام چھوڑنے یا علم سیکھنے کو ترک کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بے عملی پر اس کی پکڑ تو ہونی ہی ہے البتہ دعوت اور حصول علم کی اضافی نیکی سے وہ محروم رہ جائے گی۔ مزید اس مسئلے کو یوں سمجھیں کہ اپ اگر دعوت چھوڑ کر بھی اتنی ہی بے عمل رہتی ہیں تو بہتر ہے کہ دعوت کا کام کرتے ہوئے بے عمل رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص مخلص داعی ہوتا ہے آخر کار اک روز اس کا عمل ضرور بہتر ہو جاتا ہے۔ لیکن دعوت چھوڑ دی تو عمل تو بہتر ہوگا نہیں دعوت کا ثواب بھی چلا گیا۔ اس لیے اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہماری دعوت اخر کار ہمیں باعمل بنا دے نہ کہ ہماری بے عملی ہم سے دعوت کا کام چھڑوا دے۔

اگر آپ حق پر کھڑے ہیں تو آپ کو
چلا کر بات کرنے کی ضرورت نہیں
اور اگر آپ حق پر نہیں ہیں تو
چلا کر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں (ابو یحییٰ)

ابو یحییٰ

حرام کھانے کا علم اور حدیث جبرائیل کا مطلب

محترم نجیب احمد صاحب

السلام وعلیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ کا یہ فرمانا بظاہر درست محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تو خور ونوش کے حوالے سے نام لے کر انہی چیزوں کی حرمت بیان ہوئی ہے جن کا ذکر آپ نے سورہ مائدہ (3:5) کے حوالے فرمایا ہے۔اس کے بعد ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ دنیا بھر میں جو ان گنت چیزیں ہیں ان میں سے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں۔اس سوال کا جواب اسی سورہ مائدہ کے آغاز میں ''الیوم احل لکم الطیبات، (المائدہ4:5) یعنی آج تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کردی گئیں ہیں، کے الفاظ سے دے دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کے اس بیان کا مدعا یہ ہے کہ انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کی بنا پر دنیا میں پائی جانے والی ان تمام چیزیوں کو نہیں کھالیتا جنھیں اس کے جبڑے چبا سکیں یا جسے اس کا معدہ ہضم کر سکے۔انسانیت نے ہر دور میں کچھ خاص چیزوں کو پاکیزہ سمجھ کر کھایا ہے اور باقی چیزوں کو خبیث یا ناپاک سمجھ کر اپنے دستر خوان کی زینت نہیں بنایا۔

انسان جانتے ہیں کہ شیر اور چیتا، چیل اور گدھ، سانپ اور بچھو وغیرہ جیسی چیزیں کھانے کی نہیں ہوتیں۔انسان سمجھتے ہیں کہ گھوڑے گدھے اصلاً سواری کے جانور ہیں۔اسی طرح بول براز جیسی چیزیں لذت طعام نہیں بن سکتیں۔چنانچہ ہر دور اور ہر نسل کے لوگوں نے ہمیشہ کھانے پینے کی اشیا میں ایک دائرہ مقرر کر کے اپنے دستر خوان کی حدود کو اس دائرے تک ہی محدود کیے رکھا

ہے۔

انسانی تاریخ میں اس اصول سے صرف دو استثنا ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ چیزوں کے بارے میں ابہام پیدا ہوا اور انسانیت کی ایک بڑی تعداد نے ان کو کھانے پینے میں شامل کرلیا، اس کی ایک مثال شراب ہے جس کا پینا بظاہر خبیث نہیں لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے یقیناً نجس ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس حرکت کو موضوع بنا کر اسکے پینے سے اسی سورہ مائدہ میں روکا ہے۔(5:90)۔اس کی ایک اور مثال لحم خنزیر یعنی سور کا گوشت ہے۔ چنانچہ اسے بھی موضوع بنا کر خاص طور پر اس کی حرمت واضح کی گئی ہے۔ یہی معاملہ ان کچھ اور چیزوں کا ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں حرمت کے پہلو سے بیان ہوا ہے۔

انسانی تاریخ کا دوسرا استثنا وہ ہے جس میں انفرادی طور پر بعض افراد یا کسی علاقے کے لوگوں میں محدود طور پر کھانے پینے میں وہ چیزیں درآئیں جو خبیث ہیں۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ بعض علاقوں کے کچھ لوگ سانپ کھا لیتے ہیں۔ کچھ افریقی قبائل درندوں کا گوشت کھا جاتے ہیں۔ انفرادی طور پر بعض لوگ بول و براز کی نجاست کو بھی ہضم کر جاتے ہیں۔ مگر یہ سب محدود درجے کے انحرافات ہیں، اور انسانیت کا مجموعی خمیر ان چیزوں کے خلاف ہی رہا ہے۔ اسی پر قرآن مجید نے احل لکم الطیبات کہہ کر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس ضمن کا آخری سوال یہ ہے کہ اگر کبھی شبہہ ہو جائے کہ طیب کیا ہے اور خبیث کیا تو کس علاقے کے لوگوں کی خور و نوش کی عادات فیصلہ کن ہوں گی۔ ہمارے نزدیک یہ حیثیت ملت ابراہیم کو حاصل ہے جس میں پچھلے چار ہزار سال سے پیغمبر مسلسل آ رہے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ وحی و نبوت کی اس رہنمائی کی بنا پر ان کے ہاں کسی بھی خبیث چیز کا درآنا بہت مشکل ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کے جواب میں جس میں آپ یہ حدیث جبرائیل میں قیامت کے

حوالے سے بیان کی گئی پیش گوئی کو سمجھنا چاہتے ہیں، میں سعودی عرب کے اپنے ایک سفرنامے کا اقتباس نقل کر رہا ہوں جس میں تفصیل سے اس مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ اقتباس درج ذیل ہے:

''سرزمینِ عرب اور قربِ قیامت

سعودیوں کے اخلاق کا ذکر آ گیا ہے تو مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کے معاشرے کے بارے میں اپنے کئی سال پر محیط تجربات و مشاہدات میں آپ کو شریک کرلوں۔ کیونکہ اس برادر اسلامی ملک کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں۔ یہاں کے سفرنامے تو بہت لکھے گئے ہیں مگر زیادہ تر وہ حرمین کی داستان اور اسلام کی تاریخ تک ہی محدود رہے ہیں۔ آنے والے حج و عمرے کے لیے سیدھے حرم آتے ہیں اور اکثر وہیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ مگر میں چونکہ کافی عرصے مقیم رہا ہوں اور سعودی عرب کے تمام اہم شہروں میں گیا ہوں اس لیے میں وہ معلومات بھی آپ کو دے سکتا ہوں جو ایک زائر نہیں دے سکتا۔

سعودی عرب آنے والے شخص کے پہلے تاثرات یہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی دولت مند ملک میں آ گیا ہے۔ لمبی لمبی گاڑیاں، بلند و بالا عمارات، بڑے بڑے عظیم الشان شاپنگ سنٹرز، دنیا بھر کے فاسٹ فوڈ اداروں کی شاخیں، امرا کے بڑے بڑے محلات۔ غرض ہر جگہ دولت کی فراوانی اور دنیاوی شان و شوکت کا عنصر نمایاں ہے۔ آج سے چند سال قبل تک یہاں کا معاشرہ ایک سادہ بدوی معاشرت کا نمونہ تھا۔ جس کے کوئی آثار اب بڑے شہروں میں نظر نہیں آتے۔ یہ دراصل اس عظیم پیش گوئی کا ظہور ہے جو مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ یہ روایت صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے اور راوی بھی کوئی عام شخص نہیں سیدنا عمرؓ ہیں۔ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس جیسی اعلیٰ روایت کم ہی ہوگی۔ اس میں نہ صرف پورے دین کا خلاصہ بیان کیا

گیا ہے بلکہ قربِ قیامت کی بہت اہم پیش گوئی بھی کی گئی ہے۔ حدیث کے مطابق ایک دفعہ لوگوں کو دین سکھانے کے لیے حضرت جبرائیل انسانی شکل میں تشریف لائے تا کہ سب لوگ ان باتوں کو سن لیں اور اچھی طرح یاد رکھیں۔ میں یہاں حدیث کا وہی حصہ بیان کر رہا ہوں جسکا تعلق پیش گوئی سے ہے۔ روایت کے مطابق حضرت جبرائیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض سوالات کیے۔ آپ کا آخری سوال یہ تھا کہ قیامت کب آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ بتانے والے کو پوچھنے والے سے زیادہ خبر نہیں (یعنی دونوں کو معلوم نہیں)۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس کی کچھ نشانیاں بتلا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ ننگے پاؤں بکریاں چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے اور لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔

یہ پیش گوئی اتنے واضح طریقے پر پوری ہوئی ہے کہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے اس کی حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ صرف ایک نسل میں لوگوں کی مالی حیثیت میں انتہائی غیر معمولی تبدیلی ہے۔ یہ معلوم بات ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کا آغاز جزیرہ نما عرب سے ہوا۔ اسکے بعد عربوں کے تمدن میں کافی تبدیلی ہوئی۔ مگر اس تبدیلی کے اثرات اس خطے سے باہر ظاہر ہوئے۔ حضرت علیؓ کے دور حکومت میں خلافتِ راشدہ کا مرکز مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا۔ اسکے بعد دمشق، بغداد اور اسپین وغیرہ عربوں کی حکومت اور تمدن کے عظیم مراکز رہے۔ مگر جزیرہ نما عرب کے تمدن، ثقافت اور رہن سہن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ لوگ صدا کے بدوی تھے اور بدوی رہے۔ یہ صرف ایک نسل پہلے کی بات ہے کہ یہاں کے باسیوں کی زندگی میں تبدیلی آئی جب پٹرول کی دریافت نے عربوں کو اچانک دنیا کی امیر ترین قوم بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ننگے پاؤں بکریاں چرانے والے بلند و بالا عمارات کے مالک بن گئے۔ وہ خواتین جو لونڈیوں کی طرح زندگی گزارتی تھیں انکی لڑکیاں جب بیش قیمت لباس اور زیورات پہنے،

مرسڈیز کار میں موبائل فون ہاتھ میں لیے گھومتی ہیں تو اپنی سادہ مزاج ماں کی مالکن لگتی ہیں۔ یہ سب آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم پیش گوئی کے اس دوسرے حصے کو محض ظاہری الفاظ کے حوالے سے لیں تب بھی اسکی سچائی آخری حدتک سامنے آ چکی ہے۔ سعودی عرب دورِ حاضر میں بھی غلامی کا بڑا مرکز رہا ہے۔ ٹھیک اس زمانے میں جب یہاں تعمیر و ترقی کا دور شروع ہوا سعودی عرب میں غلامی بیک جنبش قلم ختم کر دی گئی۔۔۔ اس طرح کہ ایک حاملہ لونڈی کے ہاں اگلی صبح بیٹی پیدا ہوئی تو اسکی حیثیت ایک آزاد عورت کی تھی جسے کبھی لونڈی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔‘‘

امید ہے دونوں اشکالات رفع ہو گئے ہوں گے۔

والسلام

ابو یحییٰ

جس طرح باہر کا اندھیرا انسان سے اس کے دیکھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے اسی طرح دل کے اندر موجود تعصب کا اندھیرا بھی انسان کو حقائق دیکھنے سے روک دیتا ہے

(ابو یحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

محبوب کون؟

ایک مرتبہ اشفاق احمد اور ان کی اہلیہ بانو قدسیہ میں بحث چھڑ گئی کہ "محبوب " کی تعریف کیا ہے۔ دونوں کافی دیر تک بحث کرتے رہے یہاں تک کہ رات ہوگئی اور وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے۔ چنانچہ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے استاد کے پاس چلتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں۔ وہ جب استاد کے پاس پہنچے تو وہ کھانا پکا رہے تھے۔ دونوں نے ان سے دریافت کیا ": حضرت یہ بتایئے کہ محبوب کسے کہتے ہیں"۔ استاد نے فرمایا:

"محبوب وہ ہے جس کا (بظاہر) ناٹھیک بھی ٹھیک لگے"

مختلف لوگوں کے محبوب اپنے ذوق، فہم اور ادراک کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی بیوی بچوں کو محبوب بناتا ہے تو کوئی دولت وثروت کے گن گاتا ہے۔ لیکن ایک ربانی شخصیت کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ خدا کا نظام ربوبیت ہمیں چوبیس گھنٹے خدا کے مہربان اور شفیق ہستی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ سورج کی روشنی بلا کسی تعطل کے ہمیں حرارت پہنچاتی، رات کا سکوت، سکون فراہم کرتا، زمین کا سینا ان گنت اناج مہیا کرتا، اوزون مضر شعاعوں سے محفوظ رکھتی، لاتعداد درخت آکسیجن سے تنفس کا بندوبست کرتے اور بے شمار جانور ہمارے لئے غذا کا ذریعہ بنتے ہیں۔ آفاق کے برعکس ہمار انفس بھی اس ہستی کو مہربان اور محسن ماننے پر مجبور ہے۔ یہ سب ہزاروں ثبوت ایک غور کرنے والے کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس ہستی کو رحمان، رحیم، شفیق، مہربان، لطف وکرم نچھاور کرنے والی ہستی کے طور پر مانے۔ چنانچہ یہ بیدار مغز انسان اس ہستی سے محبت کرنے لگ جاتا، اسے محبوب مان لیتا اور اپنا تن من دھن سب اس کے لئے خاص کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔

اس حقیقت کو ماننے کے باوجود بہت سی منفی باتیں ہیں جواس محبوب ہستی کے اس حسین تصور میں داغ کی مانند نظر آتی ہیں۔لوگ دیکھتے ہیں اس دنیا میں ظالم لوگوں کولوٹ رہے ہیں، قاتل خاموشی سے مار کے فرار ہو جاتا ہے، معصوم بچے مارے جارہے ہیں، جوان عورتیں بیوہ ہورہی ہیں، غربت وافلاس سے خودکشیاں ہورہی ہیں، سرمایہ دارانہ نظام نے لوگوں کو غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔لیکن یہ رحیم اور شفیق خدا سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش ہے۔ وہ قاتلوں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ لٹیروں کو چھوٹ دیتا ہے، وہ بچوں کو یتیم ہونے دیتا ہے، وہ عورتوں کے سر سے آسرا چھنتا دیکھتا ہے لیکن خاموش ہے۔آج اس کے نام پر معصوم جانیں ضائع ہورہی ہیں لیکن وہ وضاحت نہیں کرتا۔وہ چپ چاپ تماشائی بن کر دیکھ رہا ہے لیکن کچھ نہیں بول رہا۔

یہ مشاہدہ ایک سطحی تجزیہ ہے۔اصل حقیقت یہ ہے کہ خدا رحمان ورحیم ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم، دانا اور منصوبہ بندی کرنے والا بھی ہے۔اس نے یہ دنیا امتحان گاہ کے طور پر بنائی ہے۔اس امتحان میں ہر شخص کو محدود دائرہ میں اجازت ہے کہ وہ اپنی کاپی میں جو چاہے لکھے۔وہ خود کو قاتل کے روپ میں پیش کرے یا انسانیت کی خدمت کرنے والے کی شکل میں۔وہ عورتوں کے سر سے چادر چھیننے یا انہیں سہارا دینے والا بنے۔اس آزمائش کے لئے لازم ہے کہ لوگوں کو ایک مخصوص مدت تک آزادی دی جائے تا کہ وہ اپنا پرچہ اپنی مرضی سے حل کر کے اپنی ابدی زندگی کے مقام کا تعین کر لیں۔

خدا ہی اصل محبت کے لائق ہے، حقیقی آقا ہے، تنہا پالنے والا ہے۔تمام محبتوں، عقیدتوں، نیازوں اور عبادتوں کا مرجع ہے۔وہی ابدی محبوب ہے۔اس کی حکمتوں کو مکمل طور پر سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔بس پھر ہمیں چاہئے کہ اپنے محبوب سے سب سے بڑھ کر محبت کریں اور اس کے خلاف پیدا ہونے والے وسوسوں سے صرف نظر کریں کیونکہ:

"محبوب وہ ہے جس کا (بظاہر) ناٹھیک بھی ٹھیک لگے"۔

پروفیسر محمد عقیل

امتحان میں دعا کیوں؟

اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جب ہم نے محنت کرلی تو پھر اللہ سے دعا کی کیا ضرورت ہے۔ جب ہم نے دن رات جاگ کر محنت کی ، سبجیکٹ پر عبور حاصل کرلیا، اس کے ہر ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لے لیا تو پھر دعا نے کیا کرنا ہے۔دوسری جانب ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہم تو دعاؤں سے کامیاب ہوجائیں گے۔اور جب ایسا ہونا ہے تو پھر محنت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دراصل دو انتہائیں ہیں۔حقیقت ان دونوں کے بیچ میں ہے۔

اللہ نے یہ دنیا جس اصول پر بنائی ہے اس میں کچھ کام انسان کے ذمے ہے تو کچھ کام اللہ نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔ اگر ایک کسان بیج بوئے بغیر فصل کی دعا کرے تو وہ بے وقوف ہے کیونکہ اس نے اپنے حصے کا کام ہی نہیں کیا۔اللہ کی مدد کا اظہار جو اس کی محنت سے مشروط تھا وہ نظر نہیں آئے گا۔ دوسری جانب ایک کسان جب بیج بولیتا ہے تو اب بھی دعا کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے اپنے حصے کا کام تو کرلیا لیکن بے شمار منفی عوامل اس کے کنٹرول سے باہر ہیں۔مثال کے طور پر بارش ہی نہ ہو تو فصل نہیں ہوگی، کوئی وبا پھیل جائے تو فصل تباہ ہوجائے گی۔کوئی سیلاب آجائے تو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔

اسی طرح وہ طلباء جو محنت کئے بغیر دعا پر ہی اکتفا کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔انہوں نے اپنے حصے کا کام پورا نہ کرکے کوتاہی کی ہے اور اس شرط کو پورا ہی نہیں کیا جو دعا کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ ان کی دعا ایسی ہی ہے جیسے گاڑی میں فیول ڈالے بغیر اس کو چلانے کی کوشش کرنا یا کسان کا بیج بوئے بنا فصل کی توقع کرنا۔

دوسری جانب وہ طلباء جو محنت کرچکے ہیں، انہوں نے ابھی کامیابی کی ایک شرط پوری کی

ہے۔اس محنت کے علاوہ بے شمار نا قابل کنٹرول عوامل انکی محنت کو اکارت کر سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک طالبہ نے بہت اچھی تیاری کر لی، سب کچھ پریکٹس کرلیا لیکن اس کے باوجود کئی عوامل اس کی محنت پر حاوی آ کر اسے ناکامی کی جانب دھکیل سکتے ہیں۔عین امتحان کے وقت اس کی طبیعت خراب ہوسکتی ہے، اس کے ذہن سے بات نکل سکتی ہے، پرچہ خلاف توقع آ سکتا ہے، مارکنگ میں غلطی ہوسکتی ہے،کوئی حادثہ ہوسکتا ہے وغیرہ۔چنانچہ اللہ سے استدعا کی جاتی ہے کہ اے میرے رب جو میرے بس میں تھا وہ میں نے کرلیا، اب آپ کا کام ہے کہ مجھے نا قابل کنٹرول عوامل کے اثر سے محفوظ رکھ کر نتیجہ میرے حق میں برآمد کردیجے۔اسی لئے جب کامیابی ملتی ہے تو ایک بندہ مومن سارا کریڈٹ اللہ کو دے دیتا ہے اور اسکا شکر گذار ہوتا ہے کیونکہ ہماری محنت کا پھل دینے والا وہی ہے مجرد ہماری محنت نہیں۔

اپنے حصے کا کام کئے بنا دعا پر بھروسہ کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسہ کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر۔

زیادہ ذہین اور کم محنتی افراد کی کامیابی
کا امکان جتنا کم ہوتا ہے
کم ذہین اور زیادہ محنتی افراد کی کامیابی
کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے (ابو یحییٰ)

فرح رضوان

ہاتھی اورانسان کا کینہ

شاید،تب میری عمر 8-9 سال ہوگی،"ان دنوں "سندھ کے پرسکون اور پرفضا شہر حیدرآباد میں رہا کرتے تھے،اورتب وہاں نکلنے والے بڑے جلوسوں کا ٹریڈ مارک ہوا کرتا تھا،ہاتھی- پورے شہر میں یہ اکلوتا ہاتھی تھا جو عام دنوں میں تو چڑیا گھر میں ہوتا لیکن کسی بھی اہم اور بڑے جلوس میں اس کی شرکت مہمان خصوصی کے طور پر لازمی ہوا کرتی تھی،جلوس والے روز ہاتھی کی ٹور ہی الگ ہوتی،قیمتی پوشاک اور سر سے پیر تک زیورات پہنے خراماں اور بارعب چال کے ساتھ وہ وہاں سے گزرتا تو سارے بچے والہانہ اس کا خیر مقدم کرتے , ہمارے گھر کے سامنے کافی کشادہ سڑک تھی،سو یہ جلوس عین گھر کے سامنے سے گزرتے،اور یہ منظر ہماری آنکھوں میں جم جاتے،چھوٹے سے شہر میں کوئی اور تفریح تو تھی نہیں تو ایک طرح سے یہ تفریح بھی تھی اور کراچی والے تمام ننھیالی ددھیالی کزنز پر دھاک جمانے کا واحد ذریعہ بھی،کیونکہ صرف ہاتھی ہی ایک چیز تھی جو وہاں اس طرح میسر نہ تھی۔

یہ ہاتھی انتہائی انسان دوست تھا،کیسا ہی شور شرابا ہو اس کی مستانی و باوقار چال میں کوئی کمی نہ آنے پاتی،ہم جب چڑیا گھر جاتے،تو اسے اسی مدھم رفتار میں بچوں کو سیر کراتے،مستی میں ماؤتھ آرگن بجاتے،تماشائیوں کو اپنی سونڈ سے آداب بجالاتے،اور داد وصول کرتے دیکھتے،وہ اس چھوٹے سے شہر کے لوگوں کا قیمتی اثاثہ بھی تھا اور چڑیا گھر کی رونق بھی،حالانکہ یہ میڈیا کا دور نہیں تھا لیکن یہ خبر بھی تو چھوٹی نہیں تھی کہ کل شام حیدرآباد کے چڑیا گھر رانی باغ کا ہاتھی اچانک پاگل ہوگیا،اس پر سوار بچوں اور چڑیا گھر میں موجود باقی افراد کو اسکے دیوانے پن سے بچانے کے لیے مہابت نے اپنے خنجر سے اس کی پیشانی پر کئی وار کیۓ لیکن بہت دیر تک ہر تدبیر ناکام ہونے

کے بعد مقامی فوجی افسر کو اسے گولی مار کر ہلاک کرنا پڑا۔

تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ ایک شخص کو دیکھ کر اچانک غصے میں آ گیا اور بے قابو ہو گیا ------اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس وقت جس ایک ہی فیملی کے درجن بھر بچے اس پر سوار تھے وہ ہمارے بالکل پڑوس میں تھے اور فرسٹ ہینڈ معلومات سے پتہ چلا کہ معاملہ واقعی خطرناک ہو گیا تھا، چھٹیوں میں آئے ہوئے کزنز سمیت سب ملا کر درجن بھر بچے اور صرف ایک نوجوان چاچو ہاتھی پر سوار ہوئے ہی تھے کہ اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھ لیا جو کبھی اس کا معالج رہ چکا تھا، ہاتھی کے پاؤں میں کبھی کوئی زخم تھے جن کو داغا گیا تھا، یہ داغ اس ہاتھی کے سینے میں چھپے ہوئے تھے لہذا جوں ہی وہ تکلیف دینے والا اس کے سامنے آیا ہاتھی پوری قوت سے اس پر جھپٹا اور پھر اپنے مدار سے نکل کر چاروں جانب دوڑنا شروع ہو گیا۔اوپر بیٹھے بچوں کی اللہ تعالیٰ نے بہت حفاظت فرمائی کہ انھیں درختوں کی ٹہنیوں اور بجلی کے تاروں اور چھلانگیں لگانے سے رگڑ کے باعث صرف معمولی زخم اور خراشیں ہی آئی تھیں۔

اس تمام تر صورت حال کے بعد ہم نے زندگی میں پہلی بار کچھ الفاظ نئے سنے اور ان کے معنی کو سمجھا۔ وہ تھے کینہ، بغض، عناد اور عداوت، گھر میں موجود سبھی بزرگوں نے اس واقع پر تبصرے کے دوران کئی بار یہ الفاظ دوہرائے تو ہم سب بچوں نے ان کے مطلب دریافت کئے۔ تب ابو نے ہمیں تفصیل سے نہ صرف ان کے معنی بتائے بلکہ ان صفات کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا، پھر ہمیں ہاتھی کی لاش دکھانے بھی لے گئے، ڈھیروں من وزنی ہاتھی ڈھیر ہوا پڑا تھا جسم پر قیمتی پوشاک اور زیورات کے بدلے لاتعداد مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ تماش بین عبرت پکڑ رہے تھے کہ اتنے انسان دوست کو محض اس کی ایک صفت کینے نے خسارے میں مبتلا کر دیا تھا۔

اب اتنے سالوں کے تجربات کے بعد یہی جانا ہے کہ واقعی یہ کینہ بغض عناد و عداوت حیوانی صفات ہیں، ہمیں ہمیشہ اپنا تزکیہ اور استغفار کرتے رہنا چاہیے، لوگوں کو دل سے معاف کر دینا چاہیے کیونکہ یہیں سے غیبت اور حسد اور ڈھیروں ڈھیر نیکیوں کے، راکھ کے ڈھیر میں بدل جانے کی ابتدا ہوتی ہے۔ٹھیک ہے کہ کچھ لوگ آپ کی زندگی میں بڑی آزمائش ہوتے ہیں، تو یقین کریں کہ ان کا علاج وہی ہے جو کسی بھی لاعلاج مرض کا ہوتا ہے، یعنی حتی الامکان احتیاط، پرہیز، چشم پوشی، صبر، نماز اور دعا، کیونکہ کیکٹس کے پودے کے چھو جانے پر اگر اس کو جواباً ضرب لگائیں گے تو مزید کانٹوں اور اذیت کو جھیلنا پڑے گا، لہذا ان پر اپنی توانائی وقت اور دماغی صلاحیتوں کو برباد نہ کریں، اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کر دیں اور اس سے عدل نہیں فضل مانگیں، اور پھر اس کیس کا ذکر خود سے بھی نہ کریں، کیونکہ یہ تو دنیا کے کورٹس کا بھی اصول ہے کہ عدالت کے زیر سماعت کیس پر اس وقت تک تبصرے نہیں کیے جا سکتے جب تک عدالت اپنا فیصلہ نہ سنا دے، اور آپ نے تو اعلیٰ ترین عدالت میں کیس درج کیا ہے، تو کیسا کھٹکا اور پہلے یا بعد میں، خود سے یا اوروں سے کیسا ذکر کیسا تبصرہ؟

انسان کا اصل المیہ یہ ہے کہ
بڑے بڑے حادثات کا مقابلہ وہ
بڑے حوصلے سے کرتا ہے
مگر چھوٹے چھوٹے مسائل کے ہاتھوں
اپنی صحت اور سکون گنوا دیتا ہے (ابویحییٰ)

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

تاریخ اور ختم نبوت

آج کے اس کالم میں میرے پیش نظر ختم نبوت کا ایک اہم پہلو سامنے لانا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ترین ہے، مگر ہمارے ہاں کبھی زیر بحث نہیں آتا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جس طرح یہ چیزیں زیر بحث آتی ہیں، وہاں دین کے بنیادی ماخذ بہت کمزور جگہ پر نظر آتے ہیں اور مستشرقین ان کی سند اور صداقت دونوں پر زبردست سوالیہ نشان اٹھا دیتے ہیں۔ اس انفارمیشن ایج میں جب گھر گھر انٹرنیٹ ہے اور وہ تمام تنقیدی مواد جس میں اسلام کی حقانیت پر سوالات اٹھائے ہیں چند بٹن دبا کر سامنے آجاتا ہے، ایسے میں ضروری ہے کہ اسلام کی حقانیت اور سچائی کا اثبات ان مسلمہ علمی بنیادوں پر کیا جائے جن کو دنیا مانتی ہے۔

الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑی مہربانی کی ہے کہ دین اسلام کو ختم نبوت کے بعد اس طرح محفوظ کیا ہے کہ قیامت تک اس حوالے سے کوئی سوال علمی بنیادوں پر اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا تعلق چونکہ تاریخ سے ہے اس لیے پہلے تاریخ کے علم کے حوالے سے کچھ بنیادی مقدمات کو واضح کرنا ضروری ہے۔

تاریخ کا علم

تاریخ قوموں کا حافظہ ہوتی ہے جو اکثر ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔ تاہم قومیں اور گروہ مردہ ہو جائیں تب بھی ان کی تاریخ غیر مستند داستانوں اور مزید بگڑ کر دیومالائی کہانیوں کی شکل میں انسانیت کو منتقل ہوتی رہی ہے۔ جس طرح فرد اپنے حافظے کے سہارے اپنی ذات اور اپنے ماحول کو سمجھتا ہے اسی طرح قومیں اپنے وجود کو ہمیشہ اپنی تاریخ سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت نے ہمیشہ اپنی تاریخ کو آگے منتقل کیا ہے۔تاریخ میں ماضی کے واقعات کا یہ انتقال تین طریقوں سے ہوا ہے۔

تاریخ منتقل ہونے کے تین طریقے

تاریخ کے انتقال کا پہلا طریقہ زبانی روایات کا ہے۔یعنی لوگ کسی واقعے کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ آج بھی ہوتا جب کسی جگہ کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو دیکھنے والے اس کو آگے ان لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جو براہ راست اس واقعے کے گواہ نہیں ہوتے۔یہی معاملہ ایک نسل سے دوسری نسل کا ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اگلی نسلوں تک اہم واقعات زبانی بیانات کی شکل میں منتقل کرتے ہیں۔یہی زمانہ قدیم میں ہوتا تھا۔

تاریخ کے انتقال کا دوسرا طریقہ تحریر کا ہے۔یعنی کسی واقع کے پیش آنے پر کوئی ہم عصر شخص جس نے یہ واقعہ دیکھا ہو یا ان لوگوں سے براہ راست سنا ہو جو وہاں موجود تھے، وہ اسے لکھ دے۔ ابتدائی زمانوں میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ اول تو فن تحریر عام نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ انسانی سماج جب ابتدائی شکل میں تھا تو اس کی اہمیت کا کوئی احساس تھا نہ ضرورت۔ کیونکہ زبانی روایات میں سب کچھ بیان ہو ہی جایا کرتا تھا۔تاہم علم اور سماج کے ارتقا کے ساتھ تاریخ کو لکھا جانے لگا اور عام طور پر مغربی علم میں ہیروڈوٹس جس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح تھا، پہلا مورخ سمجھا جاتا ہے۔گرچہ مشرق میں مذہبی علم کی روایات اور مذہبی کتب کو بہت پہلے ہی مرتب کر دیا گیا تھا۔

تاریخ کے انتقال کا تیسرا ذریعہ کسی قوم سے متعلق آثار قدیمہ اور اس کے باقیات ہوتے ہیں یا پھر زمانہ قدیم میں کسی قوم یا گروہ کی محفوظ رہ جانے والی کچھ نشانیاں ماہرین کی کوششوں سے منظر عام پر آجاتی ہیں اور ماضی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

قومی داستانیں اور مصدقہ تاریخ

تاریخ کے بارے میں ہمیشہ سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ گرچہ یہ ماضی کے واقعات کا ایک ریکارڈ ہے، مگر اس ریکارڈ میں کیا بات سچی ہے اور کیا جھوٹی یا پھر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ تاریخ کے ماہرین کوشش کرتے ہیں کہ ماضی کے واقعات سے متعلق ملنے والی معلومات کی دیگر خارجی ذرائع سے تصدیق کریں۔ اگر تصدیق نہیں ہو پاتی تو ایسے واقعات کو کسی خاص قوم یا کلچر کی داستان یا دیومالا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے یونانی اور ہندی دیومالا اور یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایات کے ایک بڑے حصے کو بھی بڑی حد تک اسی پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی اجتماعی طور پر منتقل ہونے والے واقعات کا اصل مسئلہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خارجی ذرائع سے ان کی تصدیق ہونے کے ذرائع معدوم ہوتے چلے جاتے تھے۔ کیونکہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں، ہجرت کر جاتی ہیں، دوسری اقوام میں ضم ہو جاتی ہیں، شکست کھا کر منتشر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں تاریخی حقائق معدوم ہو جاتے ہیں یا پھر ان کے ساتھ خواہشات اور اضافے جمع ہونے لگتے ہیں۔ مصدقہ تاریخ ماضی کے دھندلکوں، توہمات کی گرد اور مبالغوں کی کہر میں کہیں چھپ جاتی اور صرف غیر مصدقہ داستانیں، کہانیاں اور اساطیر الاولین ہی باقی بچتی تھیں۔ جو ظاہر ہے کہ تاریخ میں کوئی معتبر چیز نہیں سمجھی جاتیں۔

تاریخ کا انفرادی اور اجتماعی ریکارڈ

ان درست خبروں میں بھی دو طرح کی خبریں یا معلومات ہوتی ہے۔ ایک وہ جو انفرادی طور پر کوئی فرد یا چند افراد بیان کر رہے ہوں۔ دوسری وہ جو سب کے سب لوگ بیان کر رہے ہوں۔ ان دونوں کا فرق ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ 1947 میں برصغیر ہندوستان اور پاکستان نامی دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ واقعہ اجتماعی سطح پر پیش آیا۔ کروڑوں لوگ براہ راست اس سے

متاثر ہوئے۔انھوں نے براہ راست اس حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ یہ وہ خبر ہے جو پوری کی پوی قوم اجماعی طور پر آگے منتقل کر رہی ہے۔ آج کے دن تک دنیا میں وہ دواقوام موجود ہیں جو اس سے متاثر ہوئیں اوران کی علمی روایت پوری قوت سے اس واقعے کی تصدیق کر رہی ہے۔ایسے کسی واقعے کے جھوٹ ہونے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔اس واقعے کو اپنی تصدیق کے لیے کسی خارجی ذریعے، کسی تحریری تاریخ، کسی انفرادی شہادت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک مسلمہ ہوتا ہے۔اس کا اگر انکار کیا جائے گا تو پھر اس بات کا بھی انکار کیا جاسکتا ہے کہ زمین ہر روز سورج کی روشنی سے منور ہوتی ہے۔

تاہم اس طرح کی تاریخ صرف اجتماعی اور قومی معاملات کو ریکارڈ کرسکتی ہے۔ جبکہ تاریخ ظاہر ہے کہ اس سے کہیں زیادہ چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔خاص طور پر انفرادی نوعیت کے تمام واقعات کچھ خاص افراد کے ساتھ ہی پیش آرہے ہوتے ہیں اور انھی سے متعلق لوگوں کی گواہی پر ان کی تفصیل مرتب کی جاتی ہے۔ جیسے پاکستان کے بانی قائداعظم یا علامہ اقبال کا انتقال جس روز ہوا تھا، اس دن کیا واقعات پیش آئے۔ان کی آخری گفتگو اور کیفیات کیا تھیں۔ظاہر ہے کہ یہ واقعات چند لوگوں کے سامنے ہی پیش آرہے ہوتے ہیں، اس لیے انھی کے بیانات اور گواہی کی بنیاد پر دوسرے لوگوں کو اس کا علم ہوتا ہے۔اس ذریعے سے گرچہ کسی واقعے کی جزوی تفصیلات نیز کسی فرد کی ذاتی زندگی اور معاملات کی تفصیل حاصل ہورہی ہوتی ہے تاہم اس میں یہ امکان ہوتا ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہوگئی ہو یا اصل واقعے کے بیان میں کوئی کمی بیشی ہوگئی ہو۔اسی طرح ایک ہی واقعے کے حوالے سے مختلف اور متضاد معلومات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ چنانچہ پہلے کی شکل میں اگر یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مسلمہ معلومات سامنے آتی ہیں، مگر کمی یہ رہ جاتی ہے کہ تفصیلی اور جزئی معلومات اس ذریعے سے کبھی سامنے نہیں آتیں جبکہ دوسرے ذریعے سے

تفصیلی اور جزئی معلومات ملتی ہے، مگر اس میں ہمیشہ غلطی،، کمی بیشی اور تضاد کا امکان رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی وعلیہ وسلم کا معجزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ ہے کہ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں پہلی دفعہ اس معجزے کو جنم دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہستی جس طرح ایک مسلمہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی لائی ہوئی تعلیمات اپنی جزئی تفصیلات میں بھی ایک تاریخی مسلمے کے طور پر محفوظ کی گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو علم تاریخ کے لیے بھی ایک بالکل نئی چیز تھی۔ جیسا کہ پیچھے بیان ہوا اس سے قبل انسانی تاریخ صرف اس بات سے واقف تھی ماضی کے واقعات انفرادی رپورٹس کی بنیاد پر آگے منتقل ہوتے تھے، مگر ہمیشہ ان میں غلطی اور کمی بیشی کا امکان رہتا تھا جب کہ اجتماعی اور قومی علم کے ذریعے سے صرف بڑے واقعات ہی منتقل ہوتے تھے۔ اور ان میں بھی یہ مسئلہ تھا کہ زیادہ وقت نہیں گزرتا تھا کہ قوم ماضی کے غبار میں گم ہوجاتی اور اجتماعی اور قومی تاریخ کے بڑے واقعات بھی داستان اور اگلوں کی غیر مستند اور سنی سنائی داستان ہی بن کر رہ جاتے تھے۔

تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معجزہ ہوا کہ آپ کی ہستی کے ساتھ آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ بھی قومی طور پر آگے منتقل ہوا اور ایک ناقابل تردید مسلمہ کے طور پر آج دنیا میں موجود ہے۔ یہ معجزہ کس طرح وجود میں آیا یہ سمجھنا قارئین کے لیے بہت آسان ہوگا، اگر وہ تاریخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیے گئے حقائق کو ذہن میں رکھیں گے۔ ساتھ ہی اس معجزے کو سمجھنے کے لیے اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کیا تاریخ وجود میں آئی۔

[نوٹ: یہ اہم مضمون جاری ہے جس کی آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ شائع ہوگی۔]

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (8)

قبل از تاریخ کا زمانہ: 2500 ق م سے پہلے

ترکی میں قبل از تاریخ کے زمانے کے آثار ملتے ہیں۔ بلیک سی کی تہہ میں انسانی آبادی کے آثار ملے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ علاقے پانی سے باہر تھے۔ کسی جغرافیائی حادثے کے نتیجے میں بلیک سی کی سطح بلند ہوئی اور یہ علاقے زیر آب آ گئے۔ قدیم زمانے میں اناطولیہ کا بڑا حصہ عراق کی قدیم اکدانی سلطنت کے زیر اثر رہا ہے۔ تاریخی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طوفان کا زمانہ بھی یہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ انہی کے طوفان کے باعث بلیک سی کی سطح بلند ہوئی ہو۔

کانسی کا زمانہ: 2500 ق م سے لے کر 700 ق م

اس دور کو کانسی کا دور اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں آلات اور برتنوں کا بڑا حصہ کانسی سے بنایا جاتا تھا۔ 2500 ق م کے بعد حتیوں نے اناطولیہ میں قدم جمانے شروع کر دیے۔ یہ انڈو یورپین نسل کے کسان تھے۔ انہوں نے اناطولیہ کے علاقے میں ایک عظیم سلطنت قائم کی۔ ان کے قوانین معاصر تہذیبوں کی نسبت زیادہ انسان دوست تھے۔ ان کے پورے دور میں دیگر اقوام اناطولیہ پر حملے کرتی رہیں۔ حتیوں کا مذہب مشرکانہ تھا جس میں وہ متعدد خداؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کو پجاریوں کا سربراہ مانا جاتا تھا۔ حتی سلطنت 1400 ق م کے لگ بھگ اپنے عروج کو پہنچی۔ آہستہ آہستہ اسے زوال آ گیا اور اس کی جگہ متعدد تہذیبوں نے لے لی۔

حتیوں کے ساتھ ساتھ اناطولیہ کے کچھ حصے پر آشوری (Assyrians) بھی قابض

رہے۔ ان کا اصل وطن دجلہ اور فرات کے درمیان کی زرخیز وادی تھی جسے میسو پوٹے میا (Mesopotamia) کہا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ دجلہ وفرات سے اوپر کی جانب سفر کرتے ہوئے اناطولیہ پر قابض ہوئے۔

اس پورے عرصے میں ترکی کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم رہیں۔ مغرب کی جانب سے یہ یونانی اقوام کے زیر اثر رہا جبکہ مشرقی جانب سے یہ عراق کی قدیم سلطنتوں کے زیر اثر رہا۔ اس زمانے میں مغربی ترکی میں آئیونیا تہذیب، فراء جیا تہذیب، اور ٹرائے کی تہذیب غالب رہی۔

لوہے کا دور: 700ق م سے 330ء

لوہے کے دور کا آغاز سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوا۔ قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالی نے ان کے ہاتھ میں لوہے کو نرم کر دیا تھا جس کے باعث انہوں نے لوہے کی وسیع سلطنت قائم کی۔ ان کے بیٹے سیدنا سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں لوہے کے علاوہ دیگر قسم کی صنعتوں نے غیر معمولی ترقی کی۔ ہواؤں کو مسخر کیا گیا۔ سمندر کے خزانوں کو تلاش کیا گیا۔ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ان کی سلطنت میں سائنسی ترقی کا یہ عالم تھا کہ یمن جیسے ترقی یافتہ ملک کی ملکہ بھی ان کے محل میں پہنچ کر خود کو دیہاتی دیہاتی سا محسوس کرنے لگی۔ یہ ترقی اسرائیل سے نکل کر دیگر قوموں تک بھی پہنچی۔

اس دور میں مغربی ترکی لڈیا کی سلطنت اور مشرقی ترکی ایران کی ہاخامنشی سلطنت کے زیر اثر آ گیا۔ 334ق م میں اس علاقے کو یونان کے اسکندر نے فتح کر لیا مگر اس کے جانشین اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکے اور یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد یہاں طویل عرصے تک یونانیوں کی سلیوسی سلطنت کی حکومت رہی جو کہ 63ء تک قائم رہی۔ درمیان میں کچھ عرصے

کے لئے آرمینیوں کی حکومت بھی یہاں قائم رہی۔

اس کے کچھ عرصے بعد رومیوں کو عروج نصیب ہوا اور ان کے فاتحین نے پورا اناطولیہ فتح کر کے اسے روم کا حصہ بنا دیا۔ ابتدا میں یہ ایک جمہوری حکومت تھی لیکن بعد میں یہ بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔ انہوں نے ترکی کے علاوہ موجودہ شام، اردن، فلسطین اور مصر پر قبضہ جما لیا۔ اسی دور میں سیدنا عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے ماننے والوں کی بڑی تعداد نے ترکی کو اپنا مسکن بنایا اور یہاں دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

رومی دور: 330ء سے 1453ء

300ء کے لگ بھگ اس پورے علاقے کی اکثریت عیسائی مذہب اختیار کر چکی تھی۔ 330ء میں رومی شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر کے اسے سرکاری مذہب قرار دیا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے موجودہ استنبول کے مقام پر عظیم شہر قسطنطنیہ بسانے کا حکم دیا جو اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ اس سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جو بازنطین کہلاتا تھا۔

ساتویں صدی کے دوران مسلمانوں نے شام اور مشرقی ترکی کو فتح کر لیا جس کے نتیجے میں رومی سلطنت صرف اناطولیہ کے مغربی علاقوں تک محدود ہو گئی۔ 1037ء میں اس علاقے میں طغرل بیگ نے سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مشرقی اور وسطی اناطولیہ پر سلجوقوں اور مغربی ترکی پر رومنوں کی حکومت رہی۔ سلجوقی سلطنت کے زوال پر اس کی باقیات سے عثمانی ترکوں نے جنم لیا اور مشرقی ترکی پر اپنی حکومت قائم کر لی۔

عثمانی دور: 1453ء سے 1923ء

1453ء میں عثمانی بادشاہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد عثمانیوں نے یورپ، وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے عثمانی

سلطنت کو وسعت دی۔ عثمانیوں نے حکومت کے مختلف شعبوں کو غیر معمولی انداز میں منظّم کیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے دور کی سپر پاور بن گئے۔ آہستہ آہستہ اس سلطنت کو زوال آنا شروع ہوا۔ انیسویں صدی اس سلطنت کے زوال کا دور ہے جس میں یہ سلطنت اندرونی طور پر کمزور ہوتی چلی گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی عالمی جنگ ہوئی جس میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی برطانیہ اور فرانس کی افواج نے اس عظیم سلطنت کے ٹکڑے کر کے بہت سے ممالک بنا دیے۔

ری پبلکن دور: 1923ء تا حال

عثمانی سلطنت کی باقیات پر جدید ترکی کی حکومت قائم ہوئی۔ نوجوان ترکوں پر مشتمل افواج، جن کی قیادت مصطفیٰ کمال کے پاس تھی، نے بیک وقت سلطنت عثمانیہ اور اتحادی افواج کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ یہ لوگ اتحادیوں کو اپنے ملک سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے سیکولر دور کی ابتدا کی جو آج تک جاری ہے۔

استنبول میں آمد

اب ہم ترکی کی فضاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے جنوبی ترکی تھا جس میں اونچے نیچے پہاڑوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آہستہ آہستہ ہم آگین ریجن کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے بائیں جانب بحیرہ آگین تھا اور دائیں جانب بہت سے چھوٹے بڑے شہر پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی جھیل نظر آ رہی تھی جو کہ "بے شہر گولو" کہلاتی ہے۔ ترکی زبان میں جھیل کو گولو کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی موٹی بہت سی جھیلیں ہمیں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر "قونیہ" کا مشہور تاریخی شہر تھا جو تصوف یا صوفی ازم کے عالمی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ترکی میں واٹر مینجمنٹ

ہماری نگاہوں کے سامنے پہاڑوں کے درمیان دریا بہہ رہے تھے۔ جہاں بھی مناسب جگہ تھی وہاں ترکی کی حکومت نے ڈیم تعمیر کر کے بجلی اور آب پاشی کا اہتمام کیا تھا۔ حد نگاہ تک جھیلیں اور ڈیم پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں دریا نہیں بھی تھے وہاں بھی ڈیم بنے ہوئے تھے تا کہ بارش اور سیلاب کی صورت میں پانی کو اکٹھا کیا جا سکے۔

یہ ترکی کا پہلا امپریشن تھا کہ یہاں کی حکومتیں اپنی عوام کے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ ترکی میں جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی حکومت ہے جو اسلام پسند سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کے نام نہاد اسلام پسند سیاست دانوں نے سوائے منفی ذہنیت پھیلانے کے اور قوم کو احتجاجی نفسیات میں مبتلا کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ انہیں اگر کہیں حکومت بھی نصیب ہوئی ہے تو انہوں نے عوام کے اصل مسائل سے پہلو تہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عوام میں کوئی جڑیں موجود نہیں ہیں۔

ترکی کے اسلام پسند اس معاملے میں مختلف ہیں۔ انہوں نے عوام کے اصل مسائل جیسے مہنگائی، کرپشن، توانائی اور امن و امان کو اپنا مسئلہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پارٹی کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ترکی میں ڈیموں تعداد کی 1200 سے متجاوز ہے۔ ان میں سے 23 بڑے ڈیم ہیں جن کا مقابلہ ہمارے تربیلا اور منگلا ڈیم سے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ترکی نے دریائے فرات پر ایک بہت بڑا ڈیم تعمیر کیا ہے جس کی وجہ سے شام اور عراق سے اس کے تعلقات خراب ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں، جہاں پانچ بڑے اور بہت سے چھوٹے دریا بہتے ہیں، ڈیموں کی تعداد سو سے بھی کم ہے جن میں سے بڑے ڈیم صرف دو ہی ہیں۔ ہم بھی ڈیم بنا کر بجلی اور پانی

کے مسائل حل کر سکتے ہیں مگر ہماری قوم ایک دوسرے سے ہی مخلص نہیں ہے۔

جہاں ڈیم بنانا ملک کی ترقی کے لئے اچھا ہے وہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ ڈیم ماحولیات کو تباہ نہ کریں۔اس وجہ سے ڈیم بنانے سے قبل پانی کی ایکولوجیکل اسٹڈی کی جاتی ہے تاکہ پانی کی مخلوقات کو تباہ ہونے سے بچایا جا سکے۔ایسا کر کے ہم ان مخلوقات پر نہیں بلکہ خود اپنے آپ پر احسان کرتے ہیں کیونکہ ان جانداروں کی نسلوں کے خاتمے سے انسانی زندگی پر ایسے زہریلے اثرات رونما ہوتے ہیں جس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو کسی خاص مقصد سے بنایا ہے۔ان میں سے ایک مخلوق کا خاتمہ ماحول پر ایسے برے اثرات مرتب کرتا ہے کہ جس سے انسان اور دیگر جاندار بیماریوں اور وباؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ ہم ماحولیات سے متعلق شعور پیدا کریں اور اس طرح قرآن مجید کے حکم کے مطابق خود کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔

اب ہم کافی سرسبز علاقے پر پرواز کر رہے تھے۔یہاں پہاڑوں اور اونچے نیچے میدانوں کا سلسلہ جاری تھا۔کہیں کہیں یہ میدان سبز کی بجائے بھورے رنگ کے دکھائی دے رہے تھے۔یہ یقیناً وہ کھیت تھے جن سے فصل اتار لی گئی ہو گی۔

استنبول میں لینڈنگ

اب ہم بحیرہ مرمرہ کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بحیرہ روم ،آگین سی کی شکل میں تنگ سمندر میں تبدیل ہوتا ہے۔یہ سمندر شمال میں تنگ ہوتا چلا جاتا ہے اور آبنائے چناقی قلعہ کے پاس جا کر بالکل تنگ ہو جاتا ہے۔اس کے بعد یہ یک لخت ایک بہت بڑی جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو بحیرہ مرمرہ کہلاتی ہے۔

نیچے برسا کے گرد و نواح کے نہایت ہی سرسبز پہاڑ نظر آ رہے تھے۔یہاں عجیب بات یہ تھی

کہ سمندر اور سبزہ بیک وقت موجود تھا۔ ایک طرف نیلا سمندر اور دوسری طرف سرسبز پہاڑ۔ یہ پہاڑ عین ساحل پر واقع تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ سمندر خشکی کے ساتھ ملاپ سے ہی خوبصورت لگتا ہے ورنہ اس کی یکسانیت سے انسان بور ہو جاتا ہے۔ بحیرہ مرمرہ کے اوپر سے گزر کر جہاز استنبول کے ایئرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

استنبول دنیا کا واحد شہر ہے جو دو براعظموں میں واقع ہے۔ آبنائے باسفورس کے مشرقی جانب ایشیا اور مغربی جانب یورپ ہے۔ شہر دونوں جانب آباد ہے اور دو بڑے پل ان دونوں حصوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ ایئرپورٹ یورپی حصے میں ہے۔

جہاز کے چیف پائلٹ نے غالباً اپنے اسسٹنٹ کو تربیت دینے کے لئے لینڈنگ کرنے کا کہا تھا۔ ان حضرت نے کافی بری لینڈنگ کا مظاہرہ کیا اور جہاز کے پہیوں نے ٹھک کر کے جھٹکے سے زمین کو چھولیا۔ جہاز میں موجود ترکوں نے پرجوش انداز میں تالیاں بجا کر وطن پہنچنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو کافی عرصے بعد اپنے وطن واپس پہنچے تھے۔ کچھ ایسی ہی خوشی کا اظہار واپسی کے سفر میں سعودیوں نے جدہ کی لینڈنگ کے وقت کیا تھا مگر ان کا اسٹائل کافی مہذب تھا۔

[جاری ہے]

دعائے صحت کی درخواست

اس سفرنامے کے مصنف اور ہمارے دوست مبشر نذیر صاحب ایک ایکسڈنٹ کے بعد سخت تشویشناک حالت میں ہسپتال میں داخل ہیں۔ تمام قارئین سے ان کی مکمل اور جلد صحت یابی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

انسانی جان کی حرمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا: تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے کے لیے ایسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے تمھارے اس مہینے میں تمھارے اس شہر (مکہ) اور تمھارے اس دن (عید الاضحیٰ) کی حرمت ہے۔ تم سب اپنے پروردگار سے جا کر ملو گے، پھر وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا۔ لہٰذا میرے بعد پلٹ کر ایسے کافر یا گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ (بخاری۔ حدیث 4406)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں تو قاتل مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔ میں نے پوچھا کے قاتل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ: وہ اپنے سامنے والے کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ (بخاری۔ حدیث 31)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مسلمان کو اپنے دین کامل میں اس وقت تک (معافی کی) گنجائش رہتی ہے جب تک وہ حرام طریقے سے کسی کا خون نہ بہائے۔ (بخاری، حدیث 6862)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن مشکل کاموں میں اپنے آپ کو پھنسا کر آدمی کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی کا حرمت والا خون ایسے طریقے پر بہائے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔ (بخاری۔ حدیث 6863)